محمد نصراللہ
لیکچرار اردو، پی۔ایچ۔ڈی اسکالر (اُردو)
گورنمنٹ گورونانک پوسٹ گریجوایٹ کالج
ننکانہ صاحب

ہائیڈل برگ کی ڈائری، ایک طالب علم کی نظر سے

This article presents an impressionistic critique of Dr.Nasir Abbas Nayyar's Hydal Berg's dairy.German culture and the author's views have been critically analysed within the conceptual framework of cultural studies. Delving deep into the German cultural milieu,the author's adumberation of the significant,fascinating and astonishing information has been critically evaluated.The author's represantation of the facts about German cultural life has been spotlighted from cultural perspectives and an intellectual effort has been made to address the following questions:On what basis does personal writing become social writing? What does Dr.Nasir Abbas Nayyarthink of Germany and the Gerrmans ?How did the diary become a travellogue?What sort of questions did he ask the German and why? What stylistic features did he use in writing Hydal Berg's dairy, Which places did he visit? and What made him feel publish the diary?

ہائیڈل برگ کی ڈائری کے تفصیلی مطالعے سے قبل آغاز میں اس کے متعلق چند تعارفی باتوں کا ذکر کر لینا مناسب ہے۔ یہ ڈائری ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے ۲۰۱۱ء میں (مئی تا اکتوبر) ہائیڈل برگ میں لکھی۔ اسی دورانیے میں وہ ہائیڈل برگ یونیورسٹی کے جنوبی ایشیاء انسٹی ٹیوٹ میں پوسٹ ڈاکٹرل فیلو کے طور پر مقیم رہے۔ ان چھے مہینوں کے دوران میں انہوں نے ''نو آبادیاتی عہد کے اُردو نصابات'' کے موضوع پر جو تحقیق کی، وہ ۲۰۱۴ء میں ''ثقافتی شناخت اور استعماری اجارہ داری: نو آبادیاتی عہد کے اُردو نصابات کا مابعد نو آبادیاتی مطالعہ'' کے عنوان سے سنگ میل پبلشرز لاہور سے شائع ہو کر منظر عام پر آ چکی ہے۔

یہ ڈائری مصنف نے اپنی ان یادداشتوں کو محفوظ کرنے کی غرض سے لکھی جن یادوں کو ہر کوئی محفوظ کر لینا چاہتا ہے مگر ''ہر کوئی'' عام طور پر اپنے حافظے پر بھروسا کر بیٹھتے ہیں اور نتیجتاً حافظے کے بے ڈھنگے پن سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔ یعنی وہ باتیں محفوظ کر لیتے ہیں جنھیں بھول جانا بہتر ہوتا ہے۔ جبکہ وہ باتیں بھول جاتے ہیں جو ہمیشہ یاد رکھے

جانے کے قابل ہوتی ہیں۔لیکن ڈاکٹر ناصر عباس نیر اس غلطی کے مرتکب نہیں ہوئے، وہ الٹی چال چلے ہیں اور خوب چلے ہیں۔

انہوں نے قلمی معاونت سے ہائیڈل برگ کی یادوں کو نہ صرف اپنے لیے زندہ کر لیا ہے بلکہ قارئین کو بھی اپنے گوشہ تنہائی میں بیٹھنے کی اجازت دی ہے۔ان قارئین پر تو احسان ہی کر دیا ہے جو کسی عالم کی صحبت میں وقت گزارنے کے نیاز مند ہوں، جو کسی ایسے انسان سے ملنے کے خواہش مند ہوں جو خود سے ملتا ہو، وہ شخص کہ جس کی تنہائی بہری نہ ہو، گونگی نہ ہو، اندھی نہ ہو بلکہ جس کی تنہائی سنتی ہو، بولتی ہو اور دیکھتی بھی ہو۔ وہ عالم جو وہ جانتا ہو، جو جاننے کے طالب علم، طالب ہوں، جو یہ بھی جانتا ہو کہ علم کا طالب کیا نہیں چاہتا۔

راقم آغاز ہی میں اس بات کا ذکر کر دینا بھی مناسب سمجھتا ہے کہ جو جاننا نہیں چاہتے، کیونکہ وہ پہلے ہی بہت کچھ جان چکے ہیں، جو دیکھنا نہیں چاہتے، کیونکہ وہ بہت کچھ دیکھ چکے ہیں، جو سننا نہیں چاہتے کیونکہ وہ پہلے ہی بہت کچھ سن چکے ہیں، وہ اس ڈائری کے مطالعے سے گریز کریں تاکہ ان کا قیمتی وقت بچ جائے۔ دراصل یہ ڈائری تو ان کے لیے ہے جو نہیں جانتے اور کچھ جاننا چاہتے ہوں، جو خود کو عالم نہ سمجھتے ہوں، بلکہ طالبوں کی صف میں شمار کرتے ہوں، اس لیے راقم بھی اپنی کم علمی اور کم فہمی کا اظہار کیے دیتا ہے اور یہ بتانے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا کہ وہ ادنیٰ سا طالب علم ہے، جس نے نہ تو کبھی کسی کی ڈائری پڑھی اور نہ ہی ڈاکٹر ناصر عباس نیر کی طرح وہ خود ڈائری لکھنے کا عادی ہے، ساتھ ہی ساتھ اس طفلانہ سچائی کا اظہار بھی کیے دیتا ہے کہ اپنی حیات چند روزہ میں یہ پہلی ''ہائیڈل برگ کی ڈائری'' پڑھنے کے بعد اسے نہ صرف ادیبوں اور عالموں کی ڈائریاں پڑھنے کا شوق پیدا ہو چلا ہے بلکہ باقاعدہ ڈائری لکھنے کی مشکل عادت ڈالنے کی خواہش بھی پیدا ہوئی ہے۔

ہائیڈل برگ کی ڈائری پڑھنے کے دوران میں راقم نے جس بات کو بارہا محسوس کیا، وہ یہ تھی کہ جن باتوں کو انسان عام طور پر معمولی سمجھ رہا ہوتا ہے، جب تحریری روپ میں ڈھلتی ہیں تو وہی باتیں ذرا سے انسانی دھیان کے نتیجے میں معمولی نہیں رہ جاتیں بلکہ اپنے اندر موجود بھرپور معنویت کا احساس دلانے لگ جاتی ہیں۔شاید دنیا میں ہونے والا بڑے سے بڑا واقعہ بھی غیر معمولی نہیں رہ جاتا اگر انسان پہلی ہی نظر میں اسے غیر اہم ٹھہرا دے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے ایسی کئی عام باتوں پر دھیان دے کر انھیں خاص بنا ڈالا۔ انھوں نے کیا صرف یہی ہے کہ معمولی باتوں کو بھی معمولی نہ جانا۔ بہت ساری چھوٹی چھوٹی باتیں جنھیں عام طور پر شاید درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا، ان پر دھیان دے کر انھیں بڑی باتیں بنا دیا۔اس ڈائری میں ایک نہیں کئی ایسی باتیں ہیں جو ان کی نظر کی بدولت زندگی پا گئیں۔

جہاں وہ زندگی کی بڑی اقدار کے بارے میں سوچتے رہنے کی صلاح دیتے ہیں وہاں وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظر انداز کرنے کے بھی یکسر قائل نہیں ہیں۔مثلاً کسی طالب علم کا ایک استاد سے یہ سوال کرنا کہ آپ کے کتنے بچے ہیں؟ کتنا غیر معمولی سوال یا کتنی اہم بات ہوسکتی ہے؟ لیکن اس سوال پر پڑی ایک استاد کی نظر اسے معمولی کہاں رہنے دیتی ہے، جب وہ اس سوال کا مطلب یہ نکال رہا ہو کہ پوچھنے والے کے نزدیک اس سوال کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ اس کے نزدیک

''اہم ترین چیز انسانی رشتے ہیں''[۱]

یا کوئی یہ پوچھنے کی جسارت کرلے کہ آپ کو یورپ کیسا لگا؟ تو اس کے عام سے سوال کو یوں خاص بنا دینا :

''ہر ملک دراصل دو امیج رکھتا ہے ایک وہ جو میڈیا کتابوں، رسالوں، قصے کہانیوں، سفرناموں میں نظر آتا ہے، دوسرا وہ جسے آدمی اس ملک کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد قائم کرتا ہے۔خاص طور پر میڈیا کے ذریعے بننے والا ملکوں کا امیج، کسی نہ کسی طرح کے مفادات سے لبریز ہوتا ہے۔ پہلے یورپ کے بارے میں میرا تصور کچھ اور تھا، اب ذرا مختلف ہے۔''[۲]

بیتھوون (دنیا کا عظیم موسیقار) سٹریٹ سے گزر کر بیتھوون سے متعلق یہ حیرت انگیز بات جاننے میں بھلے ڈاکٹر ناصر عباس نیر کا کوئی کمال نہ ہو:

''اس کی زندگی کی دوسری دہائی کے دوران میں اس کی سماعت متاثر ہونے لگی جو چند سالوں میں یکسر ختم ہوگئی۔عمر کے آخری پندرہ سالوں میں اس نے اپنی سب سے شاہکار سمفنیاں ترتیب دیں جب وہ مکمل بہرہ ہو چکا تھا۔''[۳]

مگر یہ بات جان لینے کے بعد اپنی بصیرت کی شمع روشن کر کے ان پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنا جنھیں پڑھ کر قاری خود کو روشنی میں داخل ہوتے ہوئے محسوس کرے، جنھیں پڑھ کر وہ یہ محسوس کرے کہ اس نے جو پڑھا ہے، لکھنے والے نے اس کو سمجھا ہے اور اپنی سمجھ سے اس حقیقت کا اظہار کیا ہے جو حسن کا لبادہ اوڑھ کر سامنے آئی، حقائق میں سے حسن دریافت کرنا بلاشبہ ناصر عباس نیر کا کمال ضرور ہے۔

''کوئی بھی آواز سنے بغیر ایک ایسا شہ پارہ کیسے تخلیق کیا جا سکتا ہے، جس میں آوازوں کی غیر معمولی ہم آہنگی ہو، تناسب ہو، اتار چڑھاؤ ہو میرا خیال ہے وہ جب کوئی سمفنی کاغذ پر ترتیب دیتا ہے تو اسے اپنے ذہن میں سن لیتا تھا جس طرح مصور کے لیے رنگ زندہ ہوتے ہیں، اور شاعر کے لیے لفظ، اسی

طرح ایک عظیم موسیقار کے لیے آواز کبھی نہیں مرتی۔''[۴]

جہاز پر سفر کرنے کے دوران میں انھوں نے جہاز کے سفر کا دوسرے اسفار مثلاً پیدل، گھوڑا گاڑی، اونٹ سواری، ریل گاڑی اور بحری جہاز کے ساتھ موازنہ کیا تو مذکورہ اسفار کے درمیان محسوساتی فرق کو نہ صرف خود محسوس کیا بلکہ اس احساس میں اپنے قارئین کو بھی شامل ہونے کا موقع دیا۔ مثلاً یہ بات زندگی کا سچا مسافر ہی بتا سکتا ہے کہ کون سا سفر وسیلہ ظفر ہوتا ہے، ریل کے سفر سے ایک عجب سی ٹیس دل میں کیسے اٹھتی ہے، کیسے جہاز کا سفر تخیل کو انگیخت نہیں کر پاتا اور آہستہ گام (آہستہ چلنے والی ٹرین، جس کا ٹکٹ تیز روٹرین سے نسبتاً سستا ہوتا ہے) کیسے مزاجاً دیہاتی ہوتی ہے؟

''یہ گاڑی جدید دنیا کی ہا ہو اور بھاگم بھاگ سے قطعاً بے نیاز تھی، اور ہماری ٹرینوں سے کافی مماثلت رکھتی ہے (یہی وجہ تھی کہ جدید دنیا کے لوگ بھی اس میں کم کم تھے)۔ یہ ہر چند منٹ بعد رک جاتی، پتا چلتا کوئی چھوٹا سا سٹیشن ہے۔ یہ مزاجاً دیہاتی ہے۔ ہر ایک سے رہ و رسم اور سلام دعا کی قائل ہے اور اسے جاری یا مقررہ وقت پہنچنے کی کوئی فکر نہیں تھی۔''[۵]

مذکورہ اقتباسات پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر ناصر عباس نیر صرف ادبی فن پاروں کا عمدہ اور غیر روایتی مطالعہ ہی نہیں کرتے بلکہ ہائیڈل برگ کی ڈائری کے مطالعے کے دوران میں ان کے بارے میں اس حقیقت کا علم بھی ہوتا ہے کہ ان کا ذہن روز مرہ کی عام سے عام اشیاء کی بھی اتنی ہی عمدہ اور غیر روایتی تعبیریں کرتا ہے، جتنا کہ عام طور پر ادبی فن پاروں کی۔ قارئین ان کے بارے میں یہ بات تو بخوبی جانتے ہیں کہ ان کا شمار پاک و ہند کے اہم نقادوں میں ہوتا ہے مگر یہ ڈائری اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھاتی ہے کہ ادب کا نقاد حقیقت میں پوری زندگی کا نقاد ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر کی فکر ہمیشہ معنی، حق، حسن اور حیرت کی متلاشی نظر آتی ہے، ان میں سے کچھ بھی انھیں جہاں بھی مل جائے، وہاں رک جاتے ہیں اور وہ معنی جو غیر دریافت شدہ ہوں، وہ حقیقت جو سربستہ ہو، وہ حسن جسے نظر کی آرزو ہو اور وہ حیرت جو چاہے کہ اس میں کوئی مبتلا ہو، وہ اس معنی کو دریافت کرتے ہیں، اس حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہیں اس حسن کا ٹھہر کر نظارہ کرتے ہیں، اس حیرت میں ڈوب جاتے ہیں اور ان سب کا اظہار کرنا ادبی فرض سمجھتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ ایک عمارت کو غور سے دیکھتے ہوئے وہ سنگِ مرمر کی خصوصیات کو یوں بیان کرتے ہیں:

''مرمر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ پرانا نہیں ہوتا گویا وقت سے آزاد ہوتا ہے۔ اسے دیکھنے سے روشنی کا انتہائی مدھم سا احساس ہوتا ہے اور یہ احساس روشنی کو بڑھانے کی خواہش جگاتا ہے۔ کیا خاص رنگ کے

پتھروں کا خاص طرح سے سوچنے سے تعلق ہے؟ عمارتوں کا ہم پر کس قسم کا اثر ہوتا ہے؟ مجھے اورینٹل کالج کی عمارت یاد آئی ،اس کے ساتھ جانے کیا کیا یاد آیا۔ قدیم متون پر معصومانہ قسم کی تحقیق ، ترقی کی دوڑ ، سازشیں رومانس ، خودنگری کی خو، تکبر اور نہ جانے کیا کیا ؟ کچھ نہ کچھ تو اثر ہوتا ہے عمارتوں کا ۔ Congnitive نہ سہی ،effective سہی۔''[۶]

جرمنی میں مختلف عمارتوں اور مجسموں کو انھوں نے اس نگاہ سے دیکھا جس سے ایک سچا نقاد دیکھتا ہے ۔ ہر مجسمے کو ، ہر عمارت کو متن کی طرح پڑھا ،متن بھی وہ متن جس میں سے کئی معنی دریافت کرنے کا امکان ہو۔ انھوں نے جرمنی کو ایسے دیکھا جیسے کوئی نقاد غیر شخصی ہو کر آرٹ کا مطالعہ کر رہا ہو۔ ایک اجنبی کلچر کو اس قدر غیر جانبدار ہو کر دیکھا جس قدر غیر جانب دار ہو کر انسان صحیح اور غلط کی پہچان تک رسائی حاصل کر سکے ۔ انھوں نے جرمن اور پاکستانی کلچر کا موازنہ بھی کیا تو ان دونوں تہذیبوں کے فرق کو اپنے ذہن ہی میں رکھا۔

جرمن کلچر کا مطالعہ کرتے ہوئے انھوں نے اپنے میزبانوں پر تنقید کا حق خود کو کسی جگہ پر نہیں دیا۔ بلکہ فطرت کے سچے مشاہد بن کہ اسی کے مطالعے میں مگن رہے ۔ درج ذیل عبارت ان کے ذہن کی بہ حسنِ خوبی عکاسی کرتی ہے :

" The artist is the creator of beautiful things."(7)

ان کے ذہن نے کس قدر خوب صورت خیالات تخلیق کیے ۔ عام سے عام اشیاء کو اپنی نظر کے حسن سے کیسے حسین بنا دیا۔ اس کا اندازہ ہائیڈل برگ کی ڈائری کا مطالعہ کر کے ہوتا ہے۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے فطرت کے انوکھے رنگ دیکھے بھی ہیں اور دکھائے بھی ۔ کہیں وہ سرسبز پہاڑوں کی اوٹ میں سورج کو آہستہ آہستہ روپوش ہوتے ہوئے دکھاتے ہیں ، کہیں حسن کو تخلیق ہوتے ، کمال تک پہنچتے اور پھر اس کے اچانک غائب ہونے کے طلسم کا اظہار کرتے ہیں ۔ ہائیڈل برگ کی ڈائری میں جرمنی کے پل بھر میں تولہ ، پل بھر میں ماشہ ہونے والے موسموں کے انوکھے رنگوں کا جا بجا ذکر ملتا ہے مثلاً دھوپ میں ٹھنڈی اور طوفانی ہوا کا چلنا ، وہاں کے موسم کا انوکھا رنگ ہے ، جس کا اظہار انھوں نے اپنے رنگ میں کیا۔ جرمنی میں ان کی نظر ہر لمحہ حسن کو ڈھونڈتی رہی ، جہاں انھیں حسن نظر آیا اسے اتنا ٹھہر کے دیکھا کہ جب تک اس منظر کو اپنی آنکھوں میں بھر نہ لیا تب تک اس کا نظارہ کرتے رہے ۔ مناظر کو اپنے اندر اس قدر جذب کیا کہ جب جب ہاتھ میں قلم آتا رہا تب تب وہ منظر تخیل کی لوح پر آ کر الفاظ کا روپ دھارتے رہے ۔ انھوں نے فطرت کے حسن کو جس طرح سے دیکھا اور دکھایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف سوچنا ہی نہیں جانتے ، دیکھنے کے ماہر بھی ہیں ۔ سننا بھی جانتے ہیں اور سنانے کے فن میں بھی

طاق ہیں ۔ دیکھنا اور صرف دیکھنا، سننا اور صرف سننا اگر اس قدر آسان ہوتا تو مہاتما بدھ شاید یہ درس نہ دیتا:

''جب کچھ دیکھا جا رہا ہو تو صرف اسی کو دیکھنا چاہیے اور جب سنا جا رہا ہو تو صرف اسی کو سننا چاہیے اور جب محسوس کیا جا رہا ہو (اس میں اونگھنا دیکھنا اور چھونا) شامل ہیں تو پھر اسے ہی محسوس کرنا چاہیے اور جب ہم اسے سوچنے کی کیفیت میں ہوں تو پھر اس کو سوچنا چاہیے۔''[۸]

ناصر عباس نیر نے سورج کو دیکھے بغیر، اس کے ڈھلنے کا منظر بیان نہیں کیا، بلکہ جب اسے دیکھا تو صرف اسے ہی دیکھا۔ اس تجربے میں خود کو پوری طرح شامل کر کے اس کا اظہار کیا۔ وہ فطرت کے بے پایاں حسن کے زبانی اظہار تک محدود نہیں رہتے بلکہ پر کیف لمحوں میں ڈوب کر خود کو بھی اس جنت میں لے جاتے ہیں جس کا تصور ان کے تخیل میں موجود ہے۔

دنیا کے بے شمار انسان ان دیکھی جنت پر یقین رکھتے ہیں، ہوسکتا ہے ڈاکٹر ناصر عباس نیر بھی رکھتے ہوں لیکن ہائیڈل برگ کی ڈائری میں فطری حسن کے کرشمے دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ارضی جنت کے بھی قائل ہیں، انھیں جہاں جہاں ارضی جنت نظر آئی وہاں وہاں اس کا اظہار کیے بنا رہ نہ پائے، اور جہاں جہاں دنیا جنت کا روپ پیش نہ کر پائی وہاں وہاں اسے جنت نظیر بنانے کی خواہش کرتے ہوئے نظر آئے۔

سفر کے دوران میں اپنے اندر پیدا ہونے والے احساسات و جذبات کو محسوس کر کے ان کو الفاظ کا لباس پہنا دینا ایک ادیب کی باطنی ضرورت ہوسکتی ہے لیکن اس ضرورت کی تکمیل سے وہ قارئین بھی مفت میں لطف اندوز ہو لیتے ہیں جو الفاظ کے ذریعے کسی تخلیق کار کے ذہن میں پیدا ہونے والے منفرد، اچھوتے اور پر لطف خیالات کو جان لیتے ہیں۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے بھی جرمنی میں کئی مقامات کی نہ صرف خود سیر کی ہے بلکہ قارئین کو بھی اس سفر میں شامل کر کے اس ڈائری کو صرف ڈائری نہیں رہنے دیا، سفر نامہ بنا دیا ہے۔ یہ ڈائری سفر نامہ کیسے بن گئی؟ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ایک سچے سیاح کے اندر سے اپنے آپ ہی سفر نامہ نگار جنم لے لیتا ہے۔ ایک سچا سیاح ہی اس تجربے سے گزر سکتا ہے اور یہ محسوس کر سکتا ہے کہ ادب کی کسی صنف کا چشمہ انسان کے اندر سے کیسے پھوٹ پڑتا ہے؟ اور اندر ہی اندر اس کی روحانی پیاس کو بجھاتا ہوا کیسے اس کے وجود کو بھی سیراب کر جاتا ہے۔ ہائیڈل برگ کی ڈائری وہ ڈائری ہے جس میں سے صنفِ سفر نامہ پھوٹتی ہوئی دکھائی دیتی ہے مگر یہ سفر نامہ وہ سوتا ہے جو پھوٹا تو مصنف کے اندر ہے مگر اس سے سیراب ہونے والے وہ بھی ہیں جو اس کے پاس سے گزر گئے یا جن کے پاس سے یہ گزر گیا۔ اس ڈائری میں جرمنی کے بے ذائقہ کھانوں (پاکستانیوں کے لیے) سے لے کر وہاں کے دریاؤں (مائن، جرمنی کا طویل ترین

دریا)، پہاڑوں، تعلیمی اداروں، اور اہم عمارتوں کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے۔ جرمنی کے وہ مقامات جن کا تعارف اس ڈائری کے ذریعے قارئین سے ہوتا ہے، یہ ہیں: ہائیڈل برگ، فرینکفرٹ یونیورسٹی، من ہائم (Baden Wurttenberg)، شف ہاؤسن، شوٹ سنگن، پیرس، وادی موصل، کوچم کیسل برنکسٹل کاؤس وغیرہ۔

مذکورہ مقامات کی سیر کے علاوہ اس ڈائری میں جو دلچسپ ترین معلومات قارئین کے لیے ہوسکتی ہیں وہ جرمن ثقافت سے متعلق ہیں۔ ان معلومات کا تذکرہ اتنی عمدگی سے کیا گیا ہے کہ انھیں پڑھ کر جرمن کلچر سے ناواقف شخص تو حیرت سے دوچار ہو جاتا ہے وہ حیرت اپنے ساتھ خوشی کا سامان لیے ہوئے بھی ہوتی ہے شاید اس لیے کہ حیرت کے ساتھ اجنبی، انوکھے اور نئے پن کا احساس جڑا ہوا ہوتا ہے۔ بعض اوقات تو ایسی معلومات بیان کی گئی ہیں کہ انھیں جان کر اس ملک کی علمی، ادبی اور سائنسی ترقی کا اچھا خاصا رعب انسان کے ذہن پر پڑ جاتا ہے۔ مثلاً گوٹن برگ، مارٹن لوتھر، ہیبر ماس، بیتھوون، گوئٹے، ہرمن ہیسے، ہائنے، ہولڈرن، رلکے، نطشے، شوپن ہاور، ہسرل، ہیگل، مارکس اینگلز، کارل جیسپر، آئن سٹائن، ہائیڈگر، گدامر، ٹامس مان، گنتر گراس موزارٹ، باخ اور ہٹلر جیسی اہم شخصیات، اتنی اہم شخصیات کے تعلق جان کر قاری حیران رہ جاتا ہے کہ ایک ہی ملک میں اتنی اہم شخصیات آخر کیسے پیدا ہوگئیں؟

کچھ معلومات وہاں کی اہم شخصیات کے ان کے کارناموں سے متعلق ہیں جنھیں جان کر جرمنوں کے علمی اور تخلیقی اذہان کا اندازہ ہوتا ہے مثلاً دنیا کی سب سے پہلی کار جرمنی کے رہنے والے کارل بینز نے بنائی۔ ان معلومات کو پڑھ کر قاری اس نئی دنیا سے واقف ہوتا ہے جس دنیا سے واقفیت اس کے لیے حیرت انگیز تجربہ ثابت ہوسکتی ہے۔ اس ڈائری میں موجود ایسی ایک نہیں کئی باتوں کی تفصیل درج ذیل ہے:

> ''یہاں انوکھی طرز کی مساوات ہے، سلاد سے لے کر مچھلی، مٹن، مرغی، یہاں تک کہ سؤر کے گوشت تک سب کے دام یکساں ہیں۔ آپ سے جو پیسے وصول کیے جاتے ہیں، وہ شے کے نہیں، وزن کے ہوتے ہیں۔ آپ تین سو گرام سوپ لیں، چاول لیں، مچھلی لیں یا محض سلاد کے پتے، آپ کو تقریباً تین یورو دینے ہوں گے۔۔۔ جرمنی میں تمام تر سکولز کی ذمہ داری سٹیٹ کے سپرد ہے، مگر اعلیٰ تعلیم کے لیے وہ یونیورسٹیوں کو فراخ دلی سے فنڈ نہیں دیتی۔ چنانچہ بعض معاملات میں ہماری یونیورسٹی ان کی یونیورسٹیوں سے بہتر ہے۔ مثلاً پنجاب یونیورسٹی ہر سال تحقیقی منصوبوں کے لیے کروڑوں روپے رکھتی اور فیکلٹی کو دیتی ہے۔ اساتذہ کو تحقیقی مقالات پر ایک معقول رقم دیتی ہے، پرفارمنس ایوارڈ دیتی ہے، مگر یہاں یہ سب باتیں خواب و خیال ہیں۔''[۹]

'' یہاں پروفیسرز کو بے حد بلند مرتبہ حاصل ہے اور بلندی پر بس ایک ہی شخص کھڑا ہوسکتا ہے یہاں مقالات یا کتب کی تعداد کی شرط تو نہیں ،مگر ضروری ہے کہ اس نے پی ایچ ڈی کے بعد چند اہم تحقیقی منصوبے مکمل کیے ہوں۔''[۱۰]

'' سگریٹ پینے میں یہاں خواتین مردوں سے بھی آگے ہیں ، شاید اسی سے انھیں آزادی کا احساس ہی نہیں ، یقین ہوتا ہے۔''[۱۱]

'' معلوم نہیں یہ پورے جرمنی میں رواج ہے یا محض یہاں کہ جب بھی آپ کا سامنا کسی جرمن سے ہوگا ، وہ ضرور مسکرائے گا۔ یہی اس کی طرف سے ہیلو ، السّلام علیکم کا متبادل ہے ۔ مجھے یہ انداز بے حد اچھا لگا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ میں نے پہلی دفعہ مسکراہٹ کی اہمیت اور اس کا اثر دریافت کیا ہے ۔ایک مسکراتا چہرہ کسی بھی لفظ پر حاوی ہے۔''[۱۲]

''۱۹۱۷ء میں اسے سر کا خطاب ملا ، ٹیگور نے دو سال بعد اس وقت یہ واپس کر دیا ، جب جنرل ڈائر نے جلیا نوالہ باغ میں نہتے لوگوں پر گولیاں چلوائیں اور ۴۰۰ سے زیادہ (اصل تعداد ہزاروں میں ہوگی) لوگوں کو بھون ڈالا ۔ حالاں کہ یہ واقعہ ٹیگور کے بنگال میں نہیں ، ہمارے اور ہم سب کے علامہ اقبال کے پنجاب میں ہوا تھا ، میں تو اس بات پر آج بھی اسے سلام پیش کرتا ہوں۔''[۱۳]

''مرچ مصالحہ ہوتا ہی نہیں ، ان کے لیے ذائقے سے زیادہ صحت اہم ہے ، ہم اس کے الٹ چلتے ہیں ۔ اور اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ ہم لوگ ، لمبی صحت مند زندگی کے خواب سے زیادہ ، زندگی کی مسرت سے زیادہ وابستہ ہوئے ہیں۔''[۱۴]

'' یہاں پیکٹ میں بند سگریٹ بہت مہنگے ہیں ، اس لیے یونیورسٹی کا پروفیسر بھی سستے داموں سگریٹ سازی کا سامان ۔۔۔۔تمباکو ، کاغذ ، فلٹر ۔۔۔۔خریدتا ہے اور بغیر کسی جھجک مگر مہارت سے سگریٹ بناتا ہے۔''[۱۵]

'' یہاں وہ مزدور اور کسان نہیں ہیں جن کے معاشی استحصال کے خلاف جدو جہد مارکسزم کا بنیادی نقطہ ہے ۔ جرمنی میں انھیں اچھے خاصے معاوضے ملتے ہیں اور برابر ان کی نظر ثانی ہوتی رہتی ہے ۔ مجھے یاد آیا چند دن پہلے میرے علم میں یہ بات آئی تھی کہ یہاں گھریلو ملازم کا شاید ہی رواج ہو ۔ اس کا معاوضہ یونیورسٹی کے ایک نئے استاد کے تقریباً برابر ہوتا ہے۔''[۱۶]

''جرمنی میں لوگ کلیسا میں جاتے ہیں، تاہم حاضری کم ہوتی ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو لوگ کلیسا نہیں جاتے، وہ مذہب سے بیگانہ محض ہیں۔ آپ اگر کسی جرمن بک سٹور پر جائیں، تو ایک پورا شیلف Esoteric کا ہوگا، جس میں مذہب پر کتابیں مل جائیں گی۔ جو کلیسا نہیں، وہ ان بک سٹورز پر جاتے ہیں اور کسی ایک مذہب کی کتاب خرید لاتے ہیں اور اپنی مذہبی حس کی تسکین کر لیتے ہیں۔ میں نے کہا گویا، مذہب کے سلسلے میں بھی لوگ ڈیموکریٹ ہو گئے ہیں۔ یہ آزادی معمولی آزادی نہیں۔''[۱۷]

''یہاں کا کلچر یہ ہے کہ کوئی دو ہفتے کے لیے بھی کہیں جاتا ہے تو اپنا کمرہ کرائے پر چڑھا جاتا ہے کوئی اپنے شہر سے دوسرے شہر جا رہا ہو تو اشتہار کے ذریعے سے مسافروں کو متوجہ کرتا ہے جو اسی تاریخ کو اس شہر میں جانے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ خالی کمرہ اور گاڑی کی خالی نشستیں اگر چار (چار یورو) دلوا سکیں تو حرج ہی کیا ہے؟ سرمایہ دار یورپ میں ''یورو'' شاید عظیم ترین صداقت ہے۔''[۱۸]

''ایرانی اور فرانسیسی عورتیں ہر جگہ ہر وقت میک اپ کیے رکھنے کی رسیا ہیں جرمن نہیں۔''[۱۹]

مذکورہ معلومات کے سوا بھی کئی اہم باتیں ہائیڈل برگ کی ڈائری میں موجود ہیں جن کا ذکر راقم چاہنے کے باوجود بھی نہ کر سکا۔ جہاں اتنے تھوڑے عرصے میں ایسی معلومات کو دریافت کرنا، مصنف کا کمال ہے۔ وہاں ان باتوں کی رنگا رنگی بھی ان کے حسن میں اضافے کا سبب ٹھہرتی ہے۔ مذکورہ اقتباسات کو صرف معلومات کے دائرے ہی میں نہیں رکھا جا سکتا، بلکہ یہ باتیں معلومات کے دائرے سے آگے نکل کر پڑھنے والوں کی فکر اور احساس کا حصہ بھی بننا شروع ہو جاتی ہیں۔ یہ باتیں جہاں اک نئی دنیا سے واقف ہونے کا موقع دیتی ہیں ہاں اپنی دنیا پر نظر ثانی کرنے کا خیال بھی ذہن میں پیدا کرتی ہے۔

اک پاکستانی کو اک نئی جگہ پر جا کر جو کچھ نیا نظر آیا اس نے اس کا اظہار کیا۔ اک اجنبی، اک اجنبی دنیا کو جس حیرت سے دیکھتا ہے مصنف نے جرمنی کو ایسے ہی دیکھا، اور ایک دیسی، بدیس بارے جیسی باتیں سناتا ہے اس نے بھی نئی نئی باتیں ویسے ہی بتائیں گو کہ یہ سب باتیں مصنف نے لکھت جیسی اہم قدر کو زندہ رکھتے ہوئے اپنے لیے ہی لکھیں، مگر یہ قارئین کی خوش قسمتی ہے کہ جو کچھ مصنف نے اپنے لیے لکھا وہ دوسروں کو پڑھنے کی اجازت بھی دے دی۔ اس اجازت نامے کے پیچھے خالد ہمایوں کا شکریہ ادا نہ کرنا غیر مناسب ہوگا، جنھوں نے ایک ادیب کی شخصی تحریر کو سماجی تحریر بنانے کی طرف توجہ دلائی۔ اب سوال یہ ہے کہ ایک نجی تحریر سماجی تحریر کب بن جاتی ہے؟ یا نجی تحریر سماجی تحریر کس ضرورت کی بنا پر بنتی ہے؟ اس سوال کا جواب شاید ایک آدھ جملے میں دینا مشکل ہے۔ البتہ یہ

مضمون کسی نہ کسی حد تک اور ہائیڈل برگ کی ڈائری کا از خود مطالعہ ہی مکمل طور پر اس سوال کا جواب ہوسکتا ہے کہ کسی انسان کی ذاتی تحریر غیر ذاتی کب بن جاتی ہے؟ اور کیسے بن جاتی ہے؟ جہاں تک اس سوال کے جواب کا راقم کے خیالات سے تعلق ہے تو اس کے نزدیک ایک ذاتی تحریر سماجی تحریر تب بنتی ہے جب ایک ادیب کی ذاتی زندگی میں صرف اس کی ذات ہی شامل نہ ہو بلکہ وہ پورے اس سماج کے متعلق اور اس دنیا کے متعلق، جہاں وہ رہتا ہو، باخبر ہو، اس کا ہمدرد ہو، اس کا خیر خواہ ہو، اس کے دکھ درد کو محسوس کرنے والا ہو، اس کے خوشی غم میں برابر کا شریک ہو، اس دنیا کے سفید و سیاہ سے واقف ہو، جو اپنے اور اپنے ساتھ والوں کے لیے اطمینان کا سامان اکٹھا کرنا جانتا ہو، جو بڑی بڑی اقدار سے لے کر چھوٹی چھوٹی قدروں کی اہمیت سے واقف ہو، جو زندگی کے ان حقائق سے باخبر ہو جائے جن کے جاننے کے لیے اتنی تپسیا درکار ہو کہ اس کے لیے ایک پوری زندگی جینا پڑے، جو اپنی بات نہ سنانا چاہ رہا ہو، مگر لوگ سننا چاہیں۔ جب معاشرے اندر سے کھوکھلے ہو جائیں تو تخلیقی اقلیتوں کے سہاروں کی ضرورتیں محسوس ہونا شاید ایک فطری بات ہے۔ جب جاننے والے کم ہو جائیں اور نہ جاننے والوں کی تعداد بڑھ جائے تو جاننے والوں کی ذاتی زندگیوں کو سماجی زندگی کے مرحلے میں داخل ہونا پڑتا ہے۔ جب انسانوں کی بڑی تعداد تنہائی کی ہیبت کا سامنا کرنے کی جرأت کھو بیٹھے، اس وقت معاشروں کو ان انسانوں کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے جو ہیبت ناک تنہائی کے کارِزار میں اتر سکیں، گیان کر سکیں، اور اس کا حاصل بانٹ سکیں۔ اور جو وہ بانٹ رہے ہوں وہ سماج کی ضرورت ہو، شاید انھی وجوہات کی بنا پر ایک نجی زندگی کو عوام کے سامنے بے نقاب ہونا پڑتا ہے۔ مصنف کی یہ نجی یا سماجی ڈائری بس ایسی ہی کوئی شے ہے کہ جس میں سے وہ سب کچھ مل جاتا ہے جس کی سماج کو ضرورت ہے۔ اس میں سے ڈھونڈنے والوں کو کچھ نہ کچھ ضرور مل جاتا ہے، کوئی ادب ڈھونڈنا چاہے تو وہ ڈھونڈ لے گا، مذہب کی حقیقت جاننا چاہتا ہو تو جان لے گا، ثقافت کی روح سمجھنا چاہے تو سمجھ لے گا، کوئی خود سے ملنا چاہے، تو مل لے گا، فطرت سے ہم آغوش ہونا چاہے تو ہو لے گا، انسانی رشتوں کی قدر جاننا چاہے تو جان لے گا، عالمی محبت اور رواداری سیکھنا چاہے تو سیکھ لے گا، غرض یہ کہ اس ڈائری میں وہ سب کچھ ہے، جاننے والوں نے ہمیشہ جس کی جستجو کی ہے۔ یہ ڈائری جلدی میں پڑھی جانے والی شے نہیں ہے، یہ تو ٹھہر ٹھہر کر سمجھی جانے والی کتاب ہے، یہ کسی کو متاثر کرنے کی غرض سے نہیں لکھی گئی بلکہ لکھنے والے نے تو وہ لکھا ہے جو ٹھیک تھا، اس ٹھیک کو ٹھیک نہیں کہا جس کو اس کی انا ٹھیک ٹھہرا رہی ہو، لکھنے والے نے اپنی انا سے اوپر جا کر لکھا ہے، اس کے جنوں نے تو اس سے مفت میں اتنا قیمتی مال لٹوا دیا ہے۔

اس ڈائری میں کئی ایسی باتیں ہیں جنھیں اقوالِ زریں کہا جانا ہی مناسب ہوگا۔ وہ زریں اقوال جو طالبوں کی روحانی تربیت کا سامان بن سکتے ہیں۔ کچھ ایسے حقائق کا بھی ذکر آ گیا ہے جن کی تلخی انسان کو دوچار کر دیتی ہے، انھیں

پڑھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے۔ ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ کس بات کو حق جانے، وہ جو اس کے ذہن میں ہے یا وہ جو مصنف نے کہہ ڈالی، مگر حق کی آرزو کرنے والا جانب دار ہو کر آخر گھاٹے کا سودا کیوں کرے گا؟ حق کا آرزو مند غیر جانب داری سے غور و فکر کرنے کی ٹھان لے تو حقیقت تک پہنچ ہی جاتا ہے اور وہی لمحہ حیرت کا لمحہ ہوتا ہے ،انکشاف کا لمحہ ہوتا ہے، کچھ جان لینے کا لمحہ ہوتا ہے، وہ لمحہ جسے آگہی کا لمحہ کہا جا سکتا ہے، جب طالب حقیقت کے روبرو آ کھڑا ہوتا ہے، مگر یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب انسان اپنے دکھ میں اضافہ کر بیٹھتا ہے، یہی لمحہ اس حقیقت سے آشنا کر دیتا ہے کہ آدمی جب جان لیتا ہے تو اپنے دکھ میں اضافہ کر بیٹھتا ہے مگر یہ دکھ وہ دکھ ہوتا ہے جس میں مبتلا ہو کر انسان کو پچھتاوے کا احساس بھلا کہاں ہوتا ہے، سکھ ہی سکھ محسوس ہوتا ہے۔ انسانی نفسیات سے متعلق جہاں اہم حقائق کا اظہار اس ڈائری میں ملتا ہے وہاں کئی ایسی تکلیف دہ حقیقتوں کا اظہار بھی ملتا ہے جن کو انسان سہہ تو رہا ہوتا ہے مگر انھیں جان کر بھی مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں کر پاتا۔ گو کہ ایسی تلخ حقیقتوں کے متعلق سوچنا اور ان کا اظہار کرنا بہت مشکل کام ہے مگر یہ مشکل فریضہ کسی نہ کسی کو تو سرانجام دینا ہوتا ہے۔ مصنف کے انسانی زندگی کے معاملات پر گہرے غور و فکر کے نتیجے میں سامنے آنے والے کئی خیالات گو کہ تلخ ضرور ہیں مگر بے ثمر اور بے نتیجہ نہیں ہیں مثلاً بقول برٹرینڈ رسل:

> ''انسانی معاملات کے بارے میں ثمر بخش فکر کبھی کبھار سامنے آتا ہے۔ اکثر نظریہ باز روایتی قسم کے ہوتے ہیں یا پھر ان کی سوچ سطحی قسم کی ہوتی ہے۔ حقیقی اور سطحی قسم کا فکر شاذ و نادر اور مشکل ہوتا ہے مگر وہ بے ثمر اور بے نتیجہ نہیں ہوتا۔''[۲۰]

اس کتاب میں بھی کئی ایسی باتیں ہیں جو راستے کا نہیں منزل کا پتا دیتی ہیں، جو انسان کو جینے کی اہمیت کا احساس دلا کر اس کے اندر جینے کا حوصلہ پیدا کرتی ہیں، جو خود کو معاف کر کے خود سے صلح کا حل نکال لیتی ہیں۔ ایسی ہی چند باتوں کی فہرست درج ذیل ہے جو ایک گیانی کے گیان کا وہ ثمر ہے جو اس نے بانٹ دیا ہے:

> ''زندگی میں کچھ چیزیں تو بالکل لغو ہیں۔ جیسے کسی کام میں جلدی اور اس کے متعلق حد سے بڑھی ہوئی تشویش، جو بات اختیار میں نہیں، اس کے لیے فکر مندی، اور اپنے اختیار کے بارے میں فلسفیوں اور شاعروں کی باتوں پر بھروسا کرنا۔ ہمارے اپنوں کی تعداد صرف دو یا تین، کبھی کبھی ایک آدھ ہوتی ہے۔ صرف انھی کے لیے گہری تشویش ہونی چاہیے، اور انھی سے توقع رکھی جانی چاہیے، اور ان سے محبت کی جانی چاہیے، اور انھی سے کبھی کبھی شکوہ بھی کیا جانا چاہیے۔ دوسروں کے کام آنا ایک بات ہے

اور دوسروں سے محبت کرنا بالکل دوسری بات ہے ۔ دونوں کام ضروری ہیں ،مگر الگ الگ۔ دکھ کا بڑا باعث یہ ہے کہ جن کے کام آنا چاہیے ہم ان سے محبت کرنے لگ جاتے ہیں ، اور جو ہماری محبت کے مستحق ہوتے ہیں،ہم ان کے کام آنے کی غلطی کر بیٹھتے ہیں ۔ جو اپنے نہیں ہیں ان کے بارے میں سوچنا ، ایسے ہی ہے جیسے آپ گلی کے لوگوں کو دعوت دیں کہ وہ آپ کے گھر آ کر اپنی باتیں ، یعنی آپ کے خلاف باتیں کریں ۔ یہ ہم ہیں جو دوسروں کو یہ موقع اور حق دیتے ہیں کہ وہ ہماری زندگی گزاریں ، یعنی اسے برباد کریں ۔خوشی اور اطمینان سے جتنا کام ،جتنی دیر تک کیا جا سکے ، کافی ہے ۔ یہ سوچنا خود پر ایک بوجھ ڈالنے کے مترادف ہے کہ دوسرے ہمارے کام کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں ؟ جس لمحے ہم کام کر رہے ہوتے ہیں اسی لمحے ایک نور کا نکتہ روشن ہوتا ہے ، جو یہ بتاتا ہے کہ اس کام کی کیا معنویت اور اہمیت ہے ؟ نور کے اس نکتے کو نظر سے اوجھل کرنا چاہیے ، نہ اس کی خبر دوسروں کو دینی چاہیے۔ اپنی نجی دنیا کی حفاظت ، یعنی اپنی ہستی کی اہم ترین باتوں جن کی خبر صرف ہیبت ناک تنہائی میں ملتی ہے ، اور اپنے حقیقی مقصد کو ایک راز سمجھ کر اس کی حفاظت کرنی چاہیے ۔ سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز ، اپنے مستقبل اور دوسروں کے بارے میں مسلسل گمان ہیں ۔کوئی چیز ، کوئی عظیم الشان کامیابی ، کوئی بڑا صدمہ تک زندگی سے بڑا نہیں زندگی وہی ہے جو میں اس وقت اس لمحے جی رہا ہوں باقی سب وہم والتباس ہے ۔ زندگی کی سب سے بڑی قدر کے بارے میں سوچتے رہنا چاہیے ،مگر چھوٹی چھوٹی باتوں کی قدر مسلسل کرتے رہنا چاہیے ۔''[۲۱]

'' ہم اپنے محسنوں کو بھول جاتے ہیں ،مگر جنھوں نے ہم سے دشمنی کی ، یا جنھوں نے ہمارے خلاف کچھ کہا یا لکھا ، وہ ہمیں سدا یاد رہتے ہیں ''[۲۲]

'' سڑک ، رواں ،عوامی روزمرہ زندگی کا استعارہ ہے تو کسی شخصیت سے سڑک منسوب کرنے کا عمل ، اس شخصیت کو روزمرہ کی رواں دواں زندگی کا حصہ بنانے کی علامت ہے ، کسی شخصیت سے منسوب سڑک مسافروں کو یہ پیغام مسلسل دیتی ہے کہ اس شخصیت نے بھی جینے کا ایک راستہ دکھایا ہے ۔''[۲۳]

'' انسانی مصیبت کے وقت غیر جانب داری جرم بن جاتی ہے ۔''[۲۴]

'' اگر کوئی اپنے دل میں نیکی کے تکبر اور دوسروں کے اعمال پر حرف گیری سے باز رہتا ہے تو اسے انسان کی ثقافتی زندگی کی عظیم منزل سمجھنا چاہیے ۔''[۲۵]

'' تہذیبی کشمکش سے زیادہ ظالم کوئی شے نہیں آپ کو کچھ دور دراز کے لوگوں، ان کے طرزِ حیات ان کی اقدار کے خلاف اپنے دل میں نفرت اور جنگ کے جذبات پیدا کرنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے، انھیں آپ جانتے تک نہیں ہوتے انھیں آپ نے کبھی قریب سے دیکھا بھی نہیں ہوتا، اس لیے آپ کو یہ معلوم نہیں ہو پاتا کہ معمولی سے فرق کے ساتھ، وہ آپ ہی کی طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔''[۲۶]

'' سارا لطف بھٹکتے رہنے میں ہے، بھٹکا ہوا آدمی کئی نئی، نا معلوم چیزیں دریافت کر لیتا ہے۔''[۲۷]

'' سیاحت تو محبت کی طرح ہوتی ہے، جس میں تیسرا شخص محبت کا دشمن ہوتا ہے''[۲۸]

'' مذہب اپنی روح کو ایک عظیم ہستی یا بے کنار حقیقت کے روبرو محسوس کرنے، خبر کی سطح سے بلند اور آزاد ہونے، ایک بے کراں کیفیت کو عالم سرشاری میں محسوس کرنے، اور چھوٹی معمولی، نجی اغراض سے آزاد ہونے کی نا قابلِ بیان کیفیت سے عبارت ہے۔''[۲۹]

'' آدمی کا رہنما، آدمی کے سوا بھی ہے۔''[۳۰]

'' اصل بات یہ ہے کہ جس کو اپنے بزرگوں سے جو مذہب ملا ہے، اس کے مطابق زندگی بسر کرے اور خدا کو خوش رکھے اور انسانیت کے کام آئے۔''[۳۱]

مذکورہ اقتباسات میں زندگی سے جڑے ان تلخ و شیریں حقائق کا ذکر کیا گیا ہے جن کے ذکر کی ضرورت انسان ہر دور میں محسوس کرتا رہا ہے۔ ہر دور کے بڑے انسانوں نے انسان کی روحانی تربیت کے لیے ان خیالات کا اظہار کیا ہے جن سے رہنمائی حاصل کر کے انسان اپنی زندگی جنت نظیر بنا سکتا ہے۔ مثلاً مذکورہ اقتباسات میں جن خیالات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، انھی خیالات میں سے چند باتوں کی طرف برٹرینڈ رسل یوں اشارہ کرتے ہیں:

'' جن لوگوں سے ہم محبت کرتے ہیں ان سے ہمارے تعلقات کو فطری میلانات پر چھوڑا جا سکتا ہے، مگر جن سے ہم نفرت کرتے ہیں ان سے تعلقات کا معاملہ بہت اہم ہے اور وہاں ہمیں تعقل سے کام لینا چاہیے۔۔۔۔ ہم بجائے دوسروں کی جڑ کاٹنے کے اپنی خوشی کو بچانے کی زیادہ فکر کریں، ایسا کرنا ہرگز نا ممکن نہیں ہے اور ایسا کرنے سے ہم دنیا کو جنت بنا سکتے ہیں۔''[۳۱]

ڈاکٹر ناصر عباس نیر بھی اسی تعقل پسندی کی بات کرتے ہیں۔ وہ کسی بھی صورت کسی کی نفرت کو ذہن میں بٹھانے کے حق میں نہیں ہیں جہاں تک حسد کے پاگل پن کا تصور ہے، اسے وہ انسان کی اپنی ہی ذات سے دشمنی قرار دیتے ہیں، ان کے نزدیک کسی سے نفرت کرنا اپنی ہی ذات سے دشمنی مول لینے کے مترادف ہے۔ جس کا نتیجہ

انسان کی اپنی ہی ذہنی و روحانی بربادی کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ مصنف نے اپنے کام سے متعلق دوسروں کی آراء کو بالائے طاق رکھ کر خود کو اس بوجھ سے بری الذمہ ہونے کی طرف جو اشارہ کیا ہے وہ خیال جہاں پر ایک تخلیق کار کو دوسروں کی رائے کے بوجھ سے آزاد کرتا ہے وہاں وہی خیال ایک فنکار کے لیے کس قدر اطمینان کا باعث بنتا ہے اس کا ذکر ایچ ایل مینکن ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''میں نے دوسروں کو خوش کرنے کے بجائے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لیے لکھا جیسا کہ گائے گوالے کو منافع دلانے کے بجائے اپنے اطمینان کی خاطر دودھ دیتی ہے۔ میں یہ سوچ کر خوش ہوتا ہوں کہ میرے بیشتر خیالات واقعتاً قوی تھے مگر مجھے اس کی زیادہ پروا نہیں ہے۔ دنیا انھیں قبول کرے یا مسترد مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں انھیں جنم دے چکا ہوں۔'' ۳۴

مصنف کے خیالات کے مطابق انسان خود دوسروں کو یہ حق اور موقع دیتا ہے کہ دوسرے اس کی زندگی کو گزاریں اور اسے برباد کریں یہ بات اپنی جگہ پر حقیقت ہے مگر بعض اوقات ہم خود بھی کسی کی زندگی میں مداخلت کر کے اس کی زندگی گزارنے کی کوشش کرتے ہیں یا کسی کی زندگی برباد کرنے کی کوشش میں لگے ہوتے ہیں۔ یعنی کوئی ہماری زندگی گزارے یا ہم کسی کی زندگی گزاریں دونوں صورتوں میں نتیجہ دکھ کے سوا کچھ نہ نکلے گا۔ کوئی بھی انسان کسی دوسرے کی زندگی تباہ کر کے حقیقت میں اپنی ہی روحانی زندگی کو زخمی کرنے کا سامان پیدا کر رہا ہوتا ہے۔ اور اندر سے ٹوٹ جانے والا انسان باہر سے کیسے جڑ سکتا ہے، بدھ جی نے انگلی مالا سے بھی یہی کہا تھا کہ:

''اپنے مقصد کے حصول کی خاطر دوسروں کی زندگی میں مداخلت چھوڑ دو۔۔۔ظلم کا جواب رحم سے دو، نفرت کا جواب محبت سے، اور نا انصافی کا جواب معافی سے۔ نفرت اور تشدد کے راستے پر چلنا چھوڑ دو ۔۔۔خوشی جنم لیتی ہے مہربانی سے جب تم مہربانی برتو گے تو خوش رہو گے اور خوش رہو گے تو مہربان بھی ہو گے۔۔۔ انگلی مالا جس طرح تم اپنے دکھ کا کارن تھے، اسی طرح اپنی خوشی کی کنجی بھی تمھارے اپنے پاس ہے۔ اپنے سکھ کا سبب بھی تم ہی ہو۔ اندر کی شکتی سے تمھیں ایسی شانتی ملتی ہے جو دیر تک ساتھ رہتی ہے۔'' ۳۴

ان باتوں کا انگلی مالا پر وہ اثر ہوا کہ اس نے انسانی انگلیوں کی مالا اپنے گلے سے اتار پھینکی اور اپنے گرو کی بات کو پلے باندھ کر اسی سچ کا پرچار کرنے لگا جس کا تجربہ اسے خود بھی ہو چکا تھا اور وہ سچ وہی سچ تھا جس کا پرچار اس کے سامنے بدھ جی کر چکے تھے۔ اک بھکشو اپنی شانتی بھری آواز میں لوگوں کو یوں سکھشا دیتا ہے:

''ساری مشکلیں اور سارے درد، ان کا ایک کارن ہوتا ہے اور گہرائی میں جا کر دیکھو تو پتا چلتا ہے کہ ہم ہی ہیں جو اپنی جہالت کی وجہ سے، اپنی انا سے، تعلق کی شدت سے اور خواہشوں سے چمٹے رہنے کی وجہ سے دکھ کا کارن بن رہے ہیں۔''۳۵

مصنف کا یہ کہنا ہے کہ کہ ہم خود ہی دوسروں کو اپنی زندگی برباد کرنے کا موقع دیتے ہیں، اس خیال کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ ہم اپنے باطن کو خود سے دیکھنے کے بجائے دوسروں کی نظر سے دیکھنے لگ جاتے ہیں۔ حالاں کہ اکثر دوسرے ہمیں اپنے باطن میں محسوس ہی نہیں کرتے۔ مصنف کا دوسروں کو اپنی زندگی میں مداخلت سے روک دینے والا رویہ اس خیال کی عکاسی کرتا ہے کہ مصنف کو اپنے باطن سے متعلق اپنے ہی خیالات پر زیادہ اعتماد ہے۔ وہ کسی بھی صورت دوسروں کی عینک سے خود کو دیکھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ ایسا وہی انسان کر سکتا ہے جو پوری طرح خود سے آگاہ ہو جو اپنی خود آگہی کو شک کی نگاہ سے نہ دیکھتا ہو بلکہ وہ خود کو بھی جانتا ہو اور دوسروں کو بھی۔ بقول تاؤتی چینگ:

''جو دوسروں کے بارے میں جانتا ہے صاحبِ دانش ہے، جو اپنے بارے میں جانتا ہے روشن ضمیر ہے۔'' ۳۶

مصنف کے خیالات جہاں اس کے صاحبِ دانش ہونے کی عکاسی کرتے ہیں وہاں اس کے روشن ضمیر ہونے کی بھی ترجمانی کرتے ہیں۔ اکثر یونہی ہوتا ہے کہ دوسروں کی نفرت ہم اپنے دل میں پال بیٹھتے ہیں اور جواباً ہماری نفرت بھی دوسروں کے پیچھے پڑ جاتی ہے ہم نے جینا کسی اور طرح سے ہوتا ہے، جی کسی اور ڈھنگ سے جاتے ہیں، غصے اور نفرت کے بیج بو کر محبت کے پھولوں کی توقع رکھنا کس قدر غیر فطری عمل ہو سکتا ہے۔ اس کا اندازہ لگانا ہی مختصر سی زندگی میں مشکل ہوا پڑا ہے۔ مصنف نے اک مختصر سا جملہ بیان کر کے اس غصے کی فصل کو جلا کر محبت کی فصل بونے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ یہی جملہ انسان کو انسانی تعلقات کی طرف نظر ثانی کرنے کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ کسی فیصلے کے لیے تحریک پیدا کرتا ہے۔ اس حقیقت پر مبنی خیال کی تلخی کو انسان محسوس کرتا ہے اور جو تلخ ہے اسے ماننے کی فکر کرتا ہے، یہ خیال دوسروں کے متعلق ہمارے اندر پیدا ہونے والے حسد، بغض، کینے اور نفرت کو باہر نکال پھینکنے کی ہمت پیدا کرتا ہے۔ یہ خیال نفرت کے بدلے محبت نہ سہی، کم از کم نفرت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی طرف توجہ ضرور دلاتا ہے۔ کسی سے محبت کوئی زور زبردستی سے نہیں ہو سکتی اس لیے کسی کی نفرت کو زور لگا کر مٹا دینا بھی ابنِ آدم کے لیے بڑی ہمت والا کام ہو سکتا ہے۔

اس ڈائری میں مصنف نے جہاں اپنی ذات اور پرایوں سے اپنے تعلقات پر غور و فکر کرنے کی طرف اشارہ کیا ہے وہاں اپنوں کی طرف سے ملنے والی محبت کی قدر کی طرف بھی دھیان دلایا ہے، وہ اپنے جو ہم سے بے پناہ محبت

کرتے ہیں ، ہماری محبت ، جن کی زندگی کا بعض اوقات واحد سہارا ہوتی ہے اور ہم ان کو نظر انداز کر کے ان لوگوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنا بیٹھے ہیں جن کا خیال ہماری زندگی میں دکھ کے سوا کسی اور شے کا کارن نہیں ہو پاتا۔ مصنف نے ان پرایوں کا ذکر بھی کیا ہے جو پرائے ہوتے نہیں ہیں مگر انھیں غیر بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ ان غیروں سے متعلق بھی اپنے خیالات پر ایک نظر ڈالنے کی طرف توجہ دلائی ہے ، جن سے عمر بھر ملے بغیر ، کوئی بات کیے بغیر ہم ان کی نفرت کا بوجھ اٹھا کر اس دنیا سے کسی اور دنیا میں لے جاتے ہیں ۔ انسانی رشتوں میں سب سے اہم رشتہ انسانیت کا رشتہ ہے ۔ ڈائری کے کئی صفحات میں مصنف نے اس خیال کا اظہار کیا ہے ۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے زندگی کی بڑی اقدار کے بارے میں سوچتے رہنے اور چھوٹی چھوٹی باتوں کی قدر کرنے کی طرف اشارہ کیا ہے ، مگر یہ نہیں بتایا کہ ان کے اپنے نزدیک زندگی کی سب سے بڑی قدر کون سی ہے ؟ اور نہ ہی چھوٹی اقدار پر روشنی ڈالی ہے ۔ اگر وہ ایسا کرتے تو اپنے قارئین کے لیے چھوٹی اور بڑی اقدار کے فرق کو سمجھانے میں سہولت پیدا کرتے مگر انھوں نے ہائیڈل برگ کی ڈائری میں اتنا بھی اپنی ذات کو شامل نہیں کیا جتنا کہ شامل کرنا ان کا پورا پورا حق تھا۔ اس فرق کو واضح نہ کرنے کی وجہ شاید یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ شعوری طور پر چھوٹی اور بڑی اقدار کے فرق کو سمجھنے کی ذمہ داری اپنے قارئین پر ڈال رہے ہوں ۔ بہر حال جو سہولت ڈاکٹر ناصر عباس نیر اپنے قارئین کے لیے پیدا نہیں کر پائے اس سہولت کے پیدا کرنے کی کسی گستاخ طالب علم سے توقع رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے ۔ طالب علم نے اک روز ان سے پوچھ ہی لیا:

''آپ کے نزدیک زندگی کی سب سے بڑی قدر کون سی ہے ؟ '' جواب ملا :'' لکھنا'' '' چھوٹی قدر ؟'' '' کسی کو نظر انداز نہ کرنا ۔'' اس روز طالب علم نے بڑی اور چھوٹی قدر کے بارے میں فرق جانا اور یوں محسوس کیا کہ جیسے کسی نے یہ کہہ دیا ہو ، کہ اب اپنے بارے میں بھی جانو ، خود کو بھی دریافت کرو ، جو رستہ مل جائے ، اس پر چل پڑو ۔ یہ جان کر طالب علم کو جس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ کس رستے پر نہیں چلنا اور جس پر چلنا ہے پھر اسی پر چلنا ہے ۔ ایسے چلنا ہے کہ بھولے بھٹکے بھی اس رستہ پر چڑھ جائیں جس پر وہ کسی سنبھل جانے والے راہی کو چلتے ہوئے دیکھ لیں ۔ مذکورہ اقتباسات مصنف کی عمیق بصیرت کا حاصل ہیں ۔ وہ بصیرت جو ایک طویل مسافت کی ریاضت کا ثمر معلوم ہوتی ہے ۔ وہ لفظ محض لفظ نہیں ہیں ، مذکورہ جملے تو وہ پکے ہوئے خیال ہیں ، جن کا اپنا رنگ ، اپنا اثر اور اپنا ذائقہ ہے ۔ یہ خیالات وہ ثمرات ہیں جن میں زندگی کا امرت ہے ۔ یہ اقوال ان خیالات کی مکمل ، بامعنی اور دل افروز تصویریں ہیں جن کی مصوری پہلے فنکار کے اجلے باطن میں ہوئی ، پھر روح میں غوطہ زنی کے بعد ان خیالوں کی

تصویریں دماغ کی لوح پر روشن ہوئیں یعنی یہ خیالات روح وجسم کی مسافت طے کر کے طالبوں تک پہنچے ہیں اور شاید یہ ذہن میں جذب بھی اسی صورت میں ہوسکیں گے جب طالب اس سفر کو پیشِ نظر رکھیں گے جو ایک عالم نے طالب بن کر طے کیا ہوتا ہے، ان اقوال کو اقوالِ زریں کے ساتھ ساتھ اقوالِ آگہی کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ مذکورہ تمام باتوں کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ ایک عالم، صاحبِ بصیرت یا دانا انسان علم تو سکھا سکتا ہے مگر جہاں تک دانائی کا تعلق ہے وہ اس کی طرف فقط اشارہ کرسکتا ہے، توجہ دلا سکتا ہے، مگر وہ اس کو طالب کے اندر انڈیل نہیں سکتا، مگر وہ جس حکمت بھری سوچ کا اظہار کرتا ہے، وہ اس تجربے سے خود گزر چکا ہوتا ہے۔ وہ جس خیال کا اظہار کرتا ہے وہ نہ صرف اس کے معنی سے واقف ہوتا ہے بلکہ اسے پوری طرح محسوس کرنے کا تجربہ بھی کر چکا ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسے منبر پر ہوتا ہے جہاں پر وہ زندگی کے اہم حقائق کے بارے میں محاکمہ پیش کرسکتا ہے، وہ ان حقائق کی طرف اشارہ کرسکتا ہے جہاں تک ان حقائق کا تجربہ ہے وہ طالب کو اس کی سچی طلب، جستجو اور ریاضت ہی سے ہوسکتا ہے۔ سدھارتھ نے گووند سے صحیح کہا تھا کہ :

> ''علم تو سکھایا جا سکتا ہے، مگر دانائی سکھائی پڑھائی نہیں جا سکتی۔ آپ اس کی جستجو کر سکتے ہیں، اسے پا سکتے ہیں، اسے جی سکتے ہیں، اس سے قوت حاصل کر سکتے ہیں، اس کے ذریعے سے کارنامے سرانجام دے سکتے ہیں، مگر آپ یہ دانائی کسی کو سکھا نہیں سکتے، کسی کو بتا نہیں سکتے۔''[۳۷]

لہٰذا مصنف کی یہ ڈائری ان طالب علموں کے لیے ہے جو علم کے پیاسے تو ہیں ہی، دانش مندی کی طرف بھی کسی دانش مند کا اشارہ چاہتے ہیں۔ سو اس میں علم بھی ہے اور آگہی کے اشارے بھی ہیں۔ اب ان اشاروں کو کوئی کس حد تک سمجھ پاتا ہے اس کا انحصار کسی کی جستجو اور طلب پر ہے۔

گو کہ جن باتوں کی طرف مصنف نے دھیان دلایا ہے ان باتوں کی طرف تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ہر عہد کے، مفکر اور دانشور اپنے اپنے انداز سے اشارہ کر چکے ہیں، مگر ڈاکٹر ناصر عباس نیر کا اختصاص یہ ہے کہ وہ اس دنیا میں جن حقیقتوں سے آگاہ ہوئے اس کا اظہار انھوں نے جن رنگوں کے ذریعے کیا ہے، جدید دور کے قارئین کو ایسے ہی رنگوں کی ضرورت تھی۔ ان کی تحریر کا رنگ ڈھنگ اکیسویں صدی کے ادیب کی تحریر کا رنگ ڈھنگ ہے ان کی زبان حوالہ جاتی زبان نہیں ہے بلکہ احساس سے بھری (Emotive) زبان ہے، جس کا اثر بعض اوقات سمجھ پر بھی حاوی ہوجاتا ہے۔ قاری تحریر کے مزے لینے لگ جاتا ہے اور خرد کی گتھیاں سلجھانے کا عمل وقتی طور پر موقوف کرنے میں بھی عار محسوس نہیں کرتا۔ نثر میں یہ خصوصیت اسی وقت پیدا ہو پاتی ہے جب صاحب، صاحب جنوں بن کر لکھے

مصنف نے زندگی کے جن مسائل و معاملات پر اپنی بصیرت کا کیمرہ رکھا، وہ جہاں قابلِ تحریر تھے، اس سے بھی زیادہ قابلِ تشہیر تھے۔ ہائیڈل برگ کی ڈائری میں ایسی کئی باتیں ہیں جن کو پڑھ کر انسان کے اندر سے واہ نکل جاتی ہے۔ ایسی واہ جو کسی کے سامنے نہیں نکالنی پڑتی بلکہ وہ واہ جو تنہائی میں بے ساختہ گونج اٹھتی ہے جسے سُن لینے کا عمل قاری کے اپنے ہی کانوں میں رَس گھولنے لگتا ہے۔ وہ واہ جس سے مَن کی صدا جاگ اٹھنے کا امکان ہو، وہ واہ جس میں آہ بھی شامل ہو، وہ واہ جسے سننے کے لیے سماعت مضطرب ہو جائے۔

ہائیڈل برگ کی ڈائری کے مطالعے دوران یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ مصنف نے دیارِ غیر کے باسیوں سے کئی سوالات پوچھ کر ان کے جوابات جاننے کی کوشش کی ہے۔ ان سوالات پر بات کرنے سے قبل اس سوال پر غور کرنا بھی ضروری ہے کہ انسان سوال اٹھاتا کیوں ہے؟ اس کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں، ان وجوہات کا جائزہ لینے سے قبل سوالات کی مختلف نوعیّتوں پر بات کر لینا مناسب ہے مثلاً بعض سوالات کا تعلق معلومات حاصل کرنے تک محدود ہوسکتا ہے مثلاً یہ سوال کہ دنیا کی پہلی کار کس نے بنائی؟ انسان کی روحانی ضرورت پوری کرنے والا تو نہیں، البتہ اس طرح کے سوالات کے جوابات جان کر انسان کو حیرانی ضرور ہوتی ہے، اور ممکن ہے اس پر دنیا کی پہلی کار بنانے والے ملک کی ذہنی و تخلیقی ترقی کا رعب بھی پڑے، بعض سوالات کا تعلق تعلیمی و امتحانی ضرورتوں اور انسان کی روز مرہ کی بنیادی ضرورتوں سے جڑا ہوسکتا ہے جبکہ بعض سوالات کا تعلق نہ تو معلومات حاصل کرنے تک محدود ہوتا ہے اور نہ ہی ان کا تعلق انسان کی بنیادی ضرورتوں سے متعلق ہوتا ہے بلکہ وہ سوالات ایسے ہوتے ہیں جن کا تعلق باطنی ضرورتوں سے منسلک ہوتا ہے۔ ایسے سوالات انسان ان حقائق کی تلاش میں اٹھاتا ہے جن کی جستجو ہی سے انسان روحانی مسرت حاصل کر سکے، اور زندگی اس کے لیے خالی خولی نہ رہے بلکہ روحانی واردات بن جائے۔ انسان سوال اس لیے بھی اٹھاتا ہے کہ وہ اپنی دنیا سے متعلق سچائیاں جان کر اپنے اندر کے خالی پن کو بھر سکے۔ یا اس لیے اٹھاتا ہے کہ جس کو وہ حقیقت سمجھ رہا ہے اس کی شہادت حاصل کر لے۔ وہ سوال اس لیے بھی اٹھاتا ہے کہ وہ یہ جان لے کہ کیا ٹھیک نہیں ہے اور کیا ٹھیک ہے؟

ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے سوالات ان جوابات کے سننے کی خواہش نہیں رکھتے جو عام طور پر پوچھنے والا سننے کی خواہش رکھتا ہے۔ یا جن جوابات کے بارے میں وہ پہلے ہی جانتے ہوں، ان کی شہادت حاصل کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتے، بلکہ ان کے سوالات تو خالص اور حقیقی سوالات ہوتے ہیں جو ایک سچی جستجو کرنے والے کے ذہن سے پھوٹتے ہیں۔ وہ جستجو کرنے والا جو اپنے سوالات کے پرائے جوابات سننے کی بھی ہمت رکھتا ہو، دراصل

ان کے سوالات ان جوابات کے خواہش مند ہوتے ہیں جو آفاقی ہوں، عالمی ہوں، جو اصل ہوں، ایسے جوابات جنھیں جان لینے کے بعد انسان کو ان کی صداقت سے متعلق مطلق شک نہ رہ جائے، وہ جوابات جن کی روح اپنی کاملیت کا یقین اور احساس انسانی روح میں منتقل کر رہی ہو۔ ان کے کچھ سوالات ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے جوابات انھیں معلوم ہوتے ہیں یا جن کے متعلق ایک رائے ان کے ذہن میں موجود ہوتی ہے اگر وہی جواب دوسرا بھی دے دے تو اس بات پر زیادہ خوشی اور حیرت کا اظہار نہیں کرتے، البتہ جب کوئی ان کے خیالات یا رائے کے برعکس جواب دے تو پھر اپنے اور دوسرے کے خیال کے درمیان موازنہ کر کے ایک بات کو صحیح مان لیتے ہیں۔ان کے ذہن کا یہی حسن ہے کہ وہ اس خیال کو قبول کر لیتے ہیں جو واقعی قابلِ قبول ہو، وہ خیال خواہ ان کے اپنے ذہن کا پروردہ ہو یا کسی غیر کے ذہن کا۔ کئی سوالات کے جوابات انھیں کسی سے بھی نہیں مل پاتے، ان جوابات کو حاصل کرنے کی خواہش کو وہ ترک نہیں کر دیتے بلکہ خود کمر کس لیتے ہیں، اور ان کے جوابات خود سے تلاش کر کے یہ ثابت کر دیتے ہیں کہ وہ صرف علم کے طالب ہی نہیں رہتے بلکہ معلّمی کا فریضہ سرانجام دینے میں بھی اپنے فرض سے غفلت نہیں برتتے۔ انھوں نے کئی اہم اور دلچسپ سوال جرمنوں سے پوچھے، ان سوالات کے جوابات شاید ہر طالب علم جاننا چاہے گا، ان سوالوں اور ان کے جوابوں نے بھی ہائیڈل برگ کی ڈائری کی قدر و قیمت بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ راقم ڈاکٹر ناصر عباس نیر کی طرف سے پوچھے گئے ان سوالوں کی طرف اشارہ کرنا ہی کافی سمجھے گا، اگر کسی کو ان کے جواب جاننے کا ذوق ہو تو وہ ہائیڈل برگ کی ڈائری کا مطالعہ کر سکتا ہے۔ مثلاً

''امریکہ میں مسلمانوں سے نفرت کیوں کی جاتی ہے؟[۳۸]

''اکثر لوگ گلوبلائزیشن کو امریکنائزیشن کے مترادف سمجھتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟''[۳۹]

''جدید عہد میں اتنی بڑی تعداد میں بڑے آدمی (فلسفہ و ادب میں خصوصاً) جرمنی اور فرانس میں پیدا ہوئے۔۔۔ کیا بڑے ملکوں میں بڑے آدمی پیدا ہوتے ہیں؟''[۴۰]

''مارکسزم کا کیا مستقبل ہے یورپ میں؟''[۴۱]

مذکورہ سوالات کے پیچھے جان لینے کی تڑپ محسوس کی جا سکتی ہے جو اس حقیقت سے پردہ اٹھاتی ہے، کہ ایک عالم ،علم کا کس قدر طالب ہوتا ہے۔ اس ڈائری کے مطالعے کے دوران میں یہ بات بھی مصنف کی علمی اور ادبی زندگی کے بارے میں معلوم ہوتی ہے کہ مصنف کا علمی اور ادبی سفر بیک وقت ایک طالب کا، عالم کا، محقق کا، نقاد کا اور ایک تخلیق کار کا سفر ہے۔ ۱۵۲ صفحات پر مشتمل یہ مختصر سی ڈائری پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر ناصر عباس نیر زندگی کو

کس قدر سنجیدگی اور گہرائی سے دیکھتے ہیں ۔ وہ حواس اور وجدان دونوں سطحوں پر زندگی کے اندر داخل ہو کر اسے پوری طرح محسوس کر کے گزارتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جرمنی کا یہ سفر ان کے اندر سے ہو کر گزرا ہے، ہائیڈل برگ کی ڈائری پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ انھیں جرمنی پسند آیا ہے، انھیں غیر ملکی، اجنبی اور بدیسی لوگ بھی بھلے لگے، یہ بات اپنی جگہ پر اہم ہے کہ انھوں نے ان سے ملتے ہوئے اپنی شناختیں بھی برقرار رکھیں، وہ مسلمان گئے تھے، مسلمان ہی واپس آئے ، پاکستان کی طرف سے گئے تھے اور پاکستان کی محبت دل میں سلامت لے کر واپس آئے مگر ان کی شخصیت کا حسن یہ ہے کہ انھوں نے دوسروں کی شناختوں پر بھی انگلی نہیں اٹھائی ، یوں لگتا ہے کہ وہ انگلی اٹھی ہی نہیں ہے ۔ انگلی اٹھنے کی گنجائش ہوتی تو وہ ضرور اٹھاتے ، دراصل انھوں نے تو ان پرایوں کو بھی اپنا پایا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ جسے مادرِ مہربان (کرسٹینا) کہہ چکے ہیں اس پر ان کی انگلی کیسے اٹھتی ؟ پروفیسر ہانس ہرڈر کو کیسے پرایا سمجھ لیتے ؟ جن سے ملنے کی آرزو ان کے دل میں ہمیشہ موجود رہی ۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے جہاں جرمنی کو پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھا وہاں اپنے ملک پر بھی انگلی نہیں اٹھائی ۔ انھیں جرمنی کیوں پسند آیا ؟ اس سوال کا جواب اس صورت میں زیادہ بہتر طور پر مل سکتا ہے کہ قاری خود ڈائری کا مطالعہ کرے اور پھر خود سے پوچھے کہ اسے جرمنی کیسا لگا ؟ شاید پھر اسے معلوم ہو سکے کہ جرمنی اس وجہ سے بھلی جگہ ہے کہ وہاں بھی انسان بستے ہیں، جن کے سینوں میں دل ہیں جو انھی کی جنس کے لوگوں کے لیے دھڑکتے بھی ہیں، وہاں کے لوگ ویسے ہی خوب صورت ہیں، جیسے انسان ہوتے ہیں ۔ وہاں وہی سورج طلوع ہوتا ہے، غروب ہوتا ہے، جو دنیا کے کسی بھی خطے میں ہوتا ہے ۔ وہاں مزدور طبقے کے ساتھ بھی انسانوں جیسا ہی سلوک ہوتا ہے، وہاں کے ملازمین معاون و مددگار ہیں، وہاں انسانی رشتوں کی قدر ہے، وہاں کے انسان اپنی مدد آپ کے تحت زندگی گزارنے کے قائل ہیں، وہاں کے بچے بے خوف ہیں، وہاں علم کے طالب اور علم سے محبت کرنے والے بہت ہیں ۔ وہاں استاد کی عزت ہے، وہاں کی لائبریریاں فعال ہیں، وہاں کے انسان بھی زندگی ، امن اور محبت چاہتے ہیں ۔

ایسی دنیا سے مل کر ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے پاس شاید اسے پسند کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ یہ ہائیڈل برگ کی ڈائری جو چھپ گئی ہے جسے چھاپنے کی اجازت مصنف نے دے ڈالی تھی، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے خود سے اس ڈائری کے چھپنے کا اجازت نامہ حاصل کرنے کے پیچھے جو جذبہ فتح مند ثابت ہوا ہو گا یا جس جذبے نے مصنف کو اجازت دے ڈالنے پر رضا مند کر لیا ہو گا یقیناً وہ جذبہ عالمی محبت اور بھائی چارے کا جذبہ ہو گا ۔ جس کے تحت مصنف نے بالآخر اجازت دے دی کہ پاکستانی جرمنوں سے مل لیں ۔ جرمنی کو دیکھ لیں بھلے اس نظر سے جس نظر سے مصنف

نے دیکھا بھلے اس نظر سے جس نظر سے وہ خود دیکھنا چاہتے ہیں ۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ چند اوراق عالمی محبت اور رواداری کو پروان چڑھانے کی خواہش کا کامیاب اظہار ہیں ۔ وہ اظہار جو ہر زمانے کے روادار انسانوں نے اپنا فرض سمجھ کر کیا ہے ۔

حوالہ جات

۱۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، ہائیڈل برگ کی ڈائری، سنگ میل پبلشرز، لاہور، ۲۰۱ء، ص: ۲۷

۲۔ ایضاً، ص: ۲۷

۳۔ ایضاً، ص: ۲۵، ۲۶

۴۔ ایضاً، ص: ۲۶

۵۔ ایضاً، ص: ۴۱

۶۔ ایضاً، ص: ۴۷، ۴۶

7. Oscar wilde,The picture of dorian gray,collins,London,2013

۸۔ شہزاد احمد، شوماخر، پریشان حالی سے نجات، سنگ میل پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص: ۲۲۹

۹۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، ہائیڈل برگ کی ڈائری، سنگ میل پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص: ۳۷

۱۰۔ ایضاً، ص: ۵۱

۱۱۔ ایضاً، ص: ۶۵، ۶۴

۱۲۔ ایضاً، ص: ۹۷، ۹۶

۱۳۔ ایضاً، ص: ۱۱۱

۱۴۔ ایضاً، ص: ۱۱۵

۱۵۔ ایضاً، ص: ۱۲۲

۱۶۔ ایضاً، ص: ۱۳۳

۱۷۔ ایضاً، ص: ۱۳۶

۱۸۔ ایضاً، ص: ۱۳۷

۱۹۔ ایضاً،ص: ۱۲۵

۲۰۔ برٹرینڈ رسل،لوگوں کوسوچنے دو،فکشن ہاؤس، لاہور،۲۰۱۲ء،ص: ۲۱۰

۲۱۔ ناصرعباس نیر، ڈاکٹر، ہائیڈل برگ کی ڈائری، سنگ میل پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۷ء،ص: ۱۳۰،۱۲۹

۲۲۔ ایضاً،ص: ۸

۲۳۔ ایضاً،ص: ۸

۲۴۔ ایضاً،ص: ۳۶

۲۵۔ ایضاً،ص: ۴۳

۲۶۔ ایضاً،ص: ۴۸

۲۷۔ ایضاً،ص: ۶۰

۲۸۔ ایضاً،ص: ۷۳

۲۹۔ ایضاً،ص: ۸۱

۳۰۔ ایضاً،ص: ۱۲۴

۳۱۔ ایضاً،ص: ۱۴۶

۳۲۔ برٹرینڈ رسل، رسل کے تشکیکی مضامین،فکشن ہاؤس لاہور، ۲۰۱۵ء،ص: ۲۵

۳۳۔ ول ڈیورانٹ، زندگی کیا ہے۔۔۔۔فکشن ہاؤس، لاہور،۲۰۱۳ء،ص: ۶۰

۳۴۔ دہشت گرد کی گوتم بدھ سے ملاقات، آصف فرخی، سنگ میل پبلشرز، لاہور،۲۰۱۴ء،ص: ۴۰،۴۲

۳۵۔ ایضاً،ص: ۴۹

۳۶۔ شہزاد احمد، شوماخر، پریشان حالی سے نجات، سنگ میل پبلشرز، لاہور،۲۰۰۳ء،ص: ۲۲۲

۳۷۔ ہرمن ہیسے، مترجم: آصف فرخی، سدھارتھ،فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۹،ص: ۱۲۴

۳۸۔ ناصرعباس نیر، ڈاکٹر، ہائیڈل برگ کی ڈائری، سنگ میل پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۷ء،ص: ۱۲۷

۳۹۔ ایضاً،ص: ۱۲۸

۴۰۔ ایضاً،ص: ۱۳۱

۴۱۔ ایضاً،ص: ۱۳۲